ADVANCE SOCIAL SCIENCE ARCHIVE JOURNAL
Available Online: https://assajournal.com
Vol. 5 No. 01, Jan-March, 2026.Page#.4969-4980
Print ISSN: 3006-2497 Online ISSN: 3006-2500
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

A Comparative and Critical Study of Selected Difficult Qur'anic Verses (Mushkilāt al-Qurʾān) in Sūrat al-Baqarah:

An Analysis in the Light of Tafsīr-e-Mājidī and Tafsīr al-Burhān

سورۃ البقرہ کے منتخب مشکلات القرآن کا تقابلی و تحقیقی مطالعہ: تفسیر ماجدی اور تفسیر البرہان کی روشنی میں

Irsa
PhD Scholar, Islamic Studies, Abdul Wali Khan University Mardan
irsaaziz500@gmail.com
Dr. Muhammad Naeem
Assistant Professor, Islamic Studies, Abdul Wali Khan University Mardan
Dr. Muhammad Ayaz
Assistant Professor, Agriculture University Peshawar

Abstract

This research paper presents a comparative analytical study of selected interpretive issues from Surah Al-Baqarah in the light of two classical exegetical works: "Tafsir-e-Majidi" by Allama Abdul Majid Daryabadi and Tafsir al-Burhan by Allama Abdul Hadi Shah Mansoori. The study focuses on the concept of Mushkilat al-Qur'an, referring to those verses that appear conceptually complex or require deeper interpretive engagement. The research examines selected theological and interpretive themes, including guidance restricted to the pious, divine sealing of hearts in relation to human choice, the concept of divine omnipresence and direction in worship, hierarchical distinctions among prophets, the epistemological question of certainty raised by Prophet Ibrahim (peace be upon him), and interpretive dimensions related to the sanctity and purpose of mosques. These issues are analyzed through linguistic, contextual, and theological frameworks. The comparative study finds that Tafsir-e-Majidi adopts a detailed, rational, and explanatory approach, often engaging with philosophical and theological dimensions, while Tafsir al-Burhan presents a more concise, traditional, and text-centered interpretation. Despite methodological differences, both exegetes consistently aim to resolve apparent interpretive difficulties by emphasizing coherence, contextual meaning, and the absence of contradiction in the Qur'anic discourse. The study concludes that interpretive challenges in the Qur'an stem not from internal inconsistency but from varying levels of human understanding. A balanced methodological approach combining linguistic precision, theological reasoning, and contextual awareness is essential for engaging with "Mushkilat al-Qur'an" in contemporary Qur'anic studies.

Keywords: *Mushkilat al-Qur'an, Tafsir-e-Majidi, Tafsir al-Burhan, Surah Al-Baqarah, Comparative Tafsir, Qur'anic Hermeneutics, Islamic Theology, Contextual Interpretation, Epistemology of Certainty, Exegetical Methodology*

تمہید

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی آخری آسمانی کتاب اور انسانیت کے لیے دائمی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے معانی و مطالب کی تفہیم، احکام و ہدایات کی تشریح اور اسرار و حقائق کی توضیح کے لیے ہر دور میں علماء و مفسرین نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اگرچہ قرآنِ کریم اپنی اصل کے اعتبار سے واضح،

روشن اور ہدایت کا کامل منبع ہے، تاہم اس میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن کے فہم میں بظاہر دشواری، ابہام یا اشکال محسوس ہوتا ہے۔ یہی مقامات علومِ قرآن کی اصطلاح میں "مشکلاتُ القرآن" کہلاتے ہیں۔ ان مشکلات کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے؛ بعض اوقات اشکال لغوی ہوتا ہے، بعض اوقات نحوی و بلاغی، بعض مواقع پر آیات کے درمیان بظاہر تعارض محسوس ہوتا ہے، جبکہ بعض مقامات اعتقادی، فقہی یا تاریخی سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ ان اشکالات کے ازالے اور آیاتِ قرآنیہ کے صحیح مفہوم کی وضاحت کے لیے مفسرین نے اپنے اپنے مناہج کے مطابق تفسیری کاوشیں انجام دی ہیں۔

مشکلاتُ القرآن کا علم علومِ قرآن کی اہم شاخوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس فن کا بنیادی مقصد ان شبہات اور اشکالات کا ازالہ کرنا ہے جو قرآنِ مجید کے فہم میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر متعدد علماء نے مستقل کتب تصنیف کیں جن میں مشکل آیات کی توجیہ، توضیح اور تطبیق پیش کی گئی۔ ان کاوشوں نے نہ صرف قرآنِ کریم کی حقانیت کو واضح کیا بلکہ فہمِ قرآن کے نئے ابواب بھی وا کیے۔

سورۃ البقرہ قرآنِ مجید کی سب سے طویل سورت ہے جو عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات، قصصِ انبیاء، فقہی احکام اور اجتماعی ہدایات جیسے متنوع موضوعات پر مشتمل ہے۔ اسی جامعیت کے باعث اس سورت میں متعدد ایسے مقامات پائے جاتے ہیں جو مشکلاتُ القرآن کے ضمن میں خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں سورۃ البقرہ کی چند منتخب مشکل آیات کا مطالعہ دو اہم اردو تفاسیر، یعنی تفسیر ماجدی اور تفسیر البرہان، کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ دونوں تفاسیر اپنے منہج، اسلوبِ بیان اور استدلالی انداز کے اعتبار سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ اس تحقیق کا مقصد ان منتخب آیات کے متعلق دونوں مفسرین کے آراء و افکار کا تقابلی جائزہ لینا، ان کے مناہجِ تفسیر کو واضح کرنا اور پیش کردہ تفسیری توجیہات کا تحقیقی تجزیہ کرنا ہے، تاکہ ان آیات کے فہم میں معاونت حاصل ہو اور مشکلاتُ القرآن کے حل میں ان تفاسیر کی علمی خدمات کو اجاگر کیا جا سکے۔

ہدایتِ قرآن اور تخصیصِ متقین: آیت ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ کا تفسیری جائزہ

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:[1]

﴿ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾

ترجمہ: ”یہ وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔“

محلِ اشکال

اس آیت میں بظاہر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید تو پوری انسانیت کے لیے ہدایت بنا کر نازل کیا گیا ہے، جیسا کہ دیگر مقامات پر اسے ”ھدًی للناس“ کہا گیا ہے، پھر یہاں ہدایت کو صرف متقین کے ساتھ خاص کرنے کی کیا وجہ ہے؟ آیا قرآن کی ہدایت صرف متقین کے لیے مخصوص ہے یا تمام انسانوں کے لیے؟

تفسیر ماجدی کا موقف

علامہ عبد الماجد دریا آبادیؒ کے نزدیک آیت میں "للمتقین" کی قید سے مراد یہ نہیں کہ قرآن کا پیغام صرف متقین کے لیے ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت سے حقیقی فائدہ وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جن کے دلوں میں خوفِ خدا، طلبِ حق اور قبولِ حق کا جذبہ موجود ہو۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:[2]

"للمتقین یہ قید لگا کر صاف بتا دیا کہ اس قانونِ عام و ہدایتِ تام سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر خوفِ خدا موجود ہو۔ کتابِ ہدایت نازل تو ساری دنیا کے لیے ہوئی ہے، خطاب سارے عالم سے کر رہی ہے، لیکن عملاً اس سے نفع صرف وہی لوگ حاصل کریں گے جن کے

اندر حق کی طلب و تلاش ہے اور جن کا ضمیر زندہ ہے۔ آفتاب اپنی جگہ عالمتاب سہی لیکن جن کی بصارت ہی ضائع ہو چکی ہو ان کے لیے تیز سے تیز شعاعیں بے کار ہیں۔ زمین اگر مردہ ہے تو اس کے حق میں بڑی سے بڑی بارش بھی بے اثر ہے۔ غذا بہتر سے بہتر بھی ہیضہ کے مریض کے لیے لاحاصل بلکہ مضر ہے۔ قرآنِ مجید سے استفادہ کے لیے اولین شرط دل کے اندر کا تقویٰ ہے۔"

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ ماجدی ہدایتِ قرآن کے عموم اور اس سے انتفاع کے خصوص کے درمیان فرق کرتے ہیں۔

تفسیر البرہان کا موقف

علامہ عبد الہادی شاہ منصوریؒ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ قرآن کی حقیقی رہنمائی اور اس کے ثمرات متقین ہی کو حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے قلوب ہدایت قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ مختصراً لکھتے ہیں:[3]

"هو باد خصوصاً للمتقين۔"

یعنی قرآن بالخصوص متقین کے لیے ہدایت ہے۔ ان کے نزدیک تقویٰ وہ بنیادی وصف ہے جو انسان کو قرآن سے صحیح طور پر مستفید ہونے کے قابل بناتا ہے۔

تقابلی تجزیہ

دونوں مفسرین کی آراء کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے موقف میں بنیادی طور پر کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ قرآنِ مجید اپنی دعوت اور تعلیمات کے اعتبار سے تمام انسانوں کے لیے ہے، لیکن اس کی ہدایت سے حقیقی فائدہ صرف وہی افراد حاصل کرتے ہیں جو تقویٰ اور حق شناسی کی صفات سے متصف ہوں۔ البتہ اسلوبِ بیان کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے۔ علامہ ماجدی نے اس نکتے کو متعدد عقلی مثالوں اور تفصیلی توضیح کے ذریعے واضح کیا ہے، جبکہ علامہ شاہ منصوری نے نہایت اختصار کے ساتھ اسی مفہوم کو بیان کیا ہے۔

دلوں پر مہر لگنے کی حقیقت: آیت ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ﴾ کا تفسیری جائزہ

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:[4]

﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

ترجمہ: "اللہ نے (ان کے اپنے انتخاب کے نتیجے میں) ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے، اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔"

محلِ اشکال

اس آیت میں بظاہر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے خود کفار کے دلوں پر مہر لگادی ہے تو پھر ان کے کفر اور گمراہی میں ان کا کیا قصور ہے؟ نیز اگر حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی سلب کر لی گئی ہے تو ان پر عذاب کیوں دیا جائے گا؟ اس آیت سے جبر و اختیار کے مسئلے پر بھی بحث پیدا ہوتی ہے کہ آیا انسان اپنے اعمال میں مختار ہے یا مجبور۔

تفسیر ماجدی کا موقف

علامہ عبد الماجد دریا آبادیؒ کے نزدیک آیت میں مذکور "ختم" ابتدائی اور بلا سبب نہیں بلکہ انسان کے مسلسل اختیاری کفر اور حق سے اعراض کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو فطرتِ سلیم، عقل اور حق کو سمجھنے کی صلاحیت عطا فرماتا ہے، لیکن جب انسان اپنے اختیار سے بار بار حق کا انکار کرتا اور ہدایت سے منہ موڑتا ہے تو بالآخر اس پر محرومی اور ضلالت کی کیفیت مسلط ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ختم اللہ اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا فعل بندہ کے کفر اختیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ اس کے قبل، بندہ کے کفر اختیاری کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا

سبب جیسا کہ دوسری جگہ اور زیادہ صاف ارشاد ہوا ہے: 'بل طبع اللہ علیھا بکفرھم'۔"

مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فطرتِ سلیم ہر انسان کو عطا ہوتی ہے اور اس فطرتِ سلیم میں دلائلِ حق پر غور و فکر کی استعداد بھی شامل ہے، لیکن انسان جب اپنے ارادہ و عقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور آسمانی ہدایتوں اور خداوندی نشانیوں سے مسلسل منہ موڑے ہوئے قانونِ شیطانی پر چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلۂ غضبی کے تحت میں آجاتا ہے، انبیاء علیہم السلام کے سلسلۂ رحمت سے خارج ہو جاتا ہے اور نصرتِ الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اب ہر روشنی اسے تاریک اور ہر تاریکی اسے روشن نظر آنے لگتی ہے۔ اس نے اپنے لیے جو کچھ اختیار کیا وہی اللہ تعالیٰ اسے بحیثیت علت العلل و مسبب الاسباب اپنے قانونِ تکوینی کے ماتحت دینے لگتا ہے اور یہی معنی ہیں انسان کے عقل و حواس پر مہر لگ جانے کے، ورنہ ظاہر ہے کہ یہ مہرِ خداوندی کوئی مادی چیز نہیں۔"

علامہ ماجدی کے نزدیک آیت کا مقصد جبر کا اثبات نہیں بلکہ انسان کے اختیاری رویے کے انجام کو بیان کرنا ہے۔

تفسیر البرہان کا موقف

علامہ عبد الہادی شاہ منصوریؒ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:[5]

"دلوں پر مہر لگ جانا دراصل کفار کے مسلسل انکارِ حق اور ضد و ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ جب انسان بار بار حق کو رد کرتا ہے تو اس کے دل میں قبولِ حق کی صلاحیت کمزور پڑ جاتی ہے اور بالآخر وہ ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف ختم کی نسبت اس اعتبار سے ہے کہ تمام اسباب اور نتائج اسی کے نظامِ تکوین کے تحت واقع ہوتے ہیں، نہ یہ کہ بندہ ابتدا ہی سے ایمان لانے پر قادر نہ ہو۔"

تقابلی تجزیہ

دونوں مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ دلوں پر مہر لگنا کفر کا سبب نہیں بلکہ اس کا نتیجہ ہے۔ دونوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرتِ سلیم اور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے، لیکن جب انسان اپنے اختیار سے مسلسل کفر اور عناد کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ البتہ علامہ ماجدی نے اس مسئلے کو زیادہ تفصیل کے ساتھ جبر و اختیار کے تناظر میں بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ مہر لگنا قانونِ تکوینی کے تحت انسان کے اپنے انتخاب کا انجام ہے، جبکہ علامہ شاہ منصوری نے اسی مفہوم کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مساجدِ الٰہی سے روکنے والوں کا انجام: آیت ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ﴾ کا تفسیری جائزہ

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:[6]

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَى فِي خَرَابِهَا أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

ترجمہ: "اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کا ذکر کیے جانے سے روک دے اور ان کی ویرانی کی کوشش کرے! انہیں ایسا کرنا مناسب نہ تھا کہ مسجدوں میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔"

محلِ اشکال

اس آیت میں چند تفسیری اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ یہاں "مساجد" سے کون سی مساجد مراد ہیں؟ آیا اس سے تمام مساجد مراد ہیں یا خاص طور پر مسجدِ حرام یا بیت المقدس؟ دوم یہ کہ "خراب کرنا" (خرابہا) سے کیا صرف مساجد کی عمارتوں کو منہدم کرنا مراد ہے یا ذکرِ الٰہی اور عبادت سے روکنا بھی اس میں شامل ہے؟ نیز آیت میں مذکور ** ﴿إِلَّا خَائِفِينَ﴾ ** کا مفہوم بھی مفسرین کے درمیان توجہ کا مرکز رہا ہے۔

تفسیر ماجدی کا موقف

علامہ عبد الماجد دریا آبادیؒ کے نزدیک آیت کا بنیادی مقصد مساجدِ الٰہی کی حرمت اور ان کی بے حرمتی کے سنگین جرم کو واضح کرنا ہے۔ ان کے نزدیک مساجد کی ویرانی صرف عمارت کو نقصان پہنچانے کا نام نہیں بلکہ لوگوں کو ذکرِ الٰہی اور عبادت سے روکنا بھی اس میں داخل ہے۔ مزید بر آں بعض مفسرین کے قول کو نقل کرتے ہوئے وہ بیان کرتے ہیں کہ یہاں "مساجد" سے خاص طور پر مسجدِ حرام بھی مراد ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:[7]

"(مسلمانوں کے رُعب و دبدبہ سے) یعنی داخلہ کی اجازت غیر مسلم کو صرف اس حال میں دی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا محکوم ہو، اور اس کا داخلہ سرکشانہ نہیں بلکہ مطیعانہ ہو۔ قرآن مجید میں لفظ مسجد بہ صیغۂ جمع ہے، لیکن ایک قول یہ ہے کہ مساجد سے یہاں مراد مسجدِ حرام یا حرمِ کعبہ ہی ہے۔"

علامہ ماجدی کی توضیح سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں مساجد کے تقدس اور اسلامی شعائر کے احترام کو نمایاں کیا گیا ہے اور ان کی بے حرمتی کو ظلمِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔

تفسیر البرہان کا موقف

علامہ عبد الہادی شاہ منصوریؒ اس آیت کی تفسیر میں کفارِ مکہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو مسجدِ حرام میں عبادت سے روک دیا تھا۔ ان کے نزدیک آیت اسی تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر نازل ہوئی۔ تاہم اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو یہ تسلی بھی دی کہ اگرچہ انہیں ایک مخصوص مسجد میں عبادت سے روک دیا گیا ہے، لیکن پوری زمین ان کے لیے سجدہ گاہ بنادی گئی ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:[8]

"لما منعوا عن الصلاة في المسجد الحرم فقال فقد جعل الله للمؤمنين الارض كلها مسجداً، فقالوا إنما جمع لفظ المساجد وإن كان المنع المسجد واحد وهو بيت المقدس أو المسجد الحرام."

ترجمہ: "جب مسلمانوں کو مسجدِ حرام میں نماز ادا کرنے سے روکا گیا تو فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے لیے پوری زمین کو مسجد بنا دیا ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ یہاں 'مساجد' کا لفظ جمع کیوں استعمال ہوا، حالانکہ روکا تو ایک ہی مسجد (بیت المقدس یا مسجدِ حرام) سے گیا تھا۔"

علامہ شاہ منصوری کے نزدیک لفظ "مساجد" کا استعمال اگرچہ جمع کے صیغے میں ہے، لیکن اس سے کسی ایک عظیم مسجد کی طرف اشارہ بھی مقصود ہو سکتا ہے۔

تقابلی تجزیہ

دونوں مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ آیت کا تعلق اللہ کے گھروں کی حرمت اور عبادت سے روکنے کے سنگین جرم سے ہے۔ دونوں نے اس امکان کو تسلیم کیا ہے کہ یہاں "مساجد" سے خاص طور پر مسجدِ حرام یا بیت المقدس مراد ہو سکتا ہے۔ تاہم علامہ ماجدی نے آیت کے فقہی اور تمدنی پہلو پر زیادہ توجہ دی ہے اور مساجد کے احترام، غیر مسلموں کے داخلے اور شعائرِ اسلام کے تحفظ کے مباحث کو نمایاں کیا ہے، جبکہ علامہ شاہ منصوری نے تاریخی پس منظر اور لفظ "مساجد" کے صیغۂ جمع کی توجیہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ ان کی تفسیر میں اس نکتے کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ اسلام میں عبادت کسی ایک مقام تک محدود نہیں بلکہ پوری زمین اہلِ ایمان کے لیے عبادت گاہ ہے۔

آیت ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ کا تفسیری جائزہ

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:[9]

﴿وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾

ترجمہ: "اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، پس تم جدھر بھی رخ کرو اُدھر ہی اللہ کی توجہ ہے، بے شک اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔"

محلِ اشکال

اس آیت کے متعلق مفسرین کے ہاں دو بنیادی اشکالات زیرِ بحث آئے ہیں۔ پہلا یہ کہ آیت میں مذکور **"وَجْهُ اللَّهِ"** سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے اللہ تعالیٰ کے لیے حقیقی چہرہ مراد ہے یا اس کی ذاتِ اقدس؟ دوسرا اشکال یہ ہے کہ اگر جدھر بھی رخ کرنے کو اللہ کی طرف متوجہ ہونا قرار دیا گیا ہے تو پھر نماز میں قبلہ کی تعیین اور بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم کس معنی میں باقی رہتا ہے؟ ان سوالات کے جواب میں مفسرین نے مختلف جہات سے آیت کی تشریح کی ہے۔

تفسیر ماجدی کا موقف

علامہ عبد الماجد دریا آبادیؒ اس آیت کو اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور اس کے زمان و مکان سے ماوراء ہونے کے بیان پر محمول کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک "وجہ اللہ" سے مراد اللہ تعالیٰ کا ظاہری چہرہ نہیں بلکہ اس کی ذاتِ اقدس ہے۔ وہ اس آیت کو عقیدۂ تجسیم کی تردید قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی وہ خدائے واحد جو ہر مکان، ہر ظرف کی قید سے پاک ہے، ہر سمت و جہت سے منزہ ہے۔ اس کی ذاتِ پاک کی تجلیات ہر طرف ہیں، سب کہیں ہیں۔ جدھر بھی رخ کروگے جلوہ اس کا پاؤ گے۔ اس کی تجلیات کو کسی آسمانوں اور زمین کی خاص جہت کے ساتھ محدود و مخصوص کر لینا عین جہل ہے۔ وجہ کا لفظی معنی چہرہ کے ہیں۔ وجہ اللہ کی ترکیب جب آئے گی، مراد ذات ہی سے ہوگی اور وہی یہاں بھی مراد ہے۔"

مزید فرماتے ہیں:[10]

"آیت میں پوری تردید آگئی عقیدۂ تجسیم کی۔ صوفیاء نے کہا ہے کہ ہم بھی اسی طرح کائنات میں جس چیز پر بھی نظر ڈالتے ہیں انوارِ حق ہی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔"

علامہ ماجدی کے نزدیک آیت کا اصل مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص سمت یا مقام کا محتاج نہیں بلکہ اس کی ذات اور اس کی قدرت کے آثار ہر جگہ موجود ہیں۔

تفسیر البرہان کا موقف

علامہ عبد الہادی شاہ منصوریؒ اس آیت کی تفسیر کو نماز اور قبلہ کے احکام کے تناظر میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آیت کا یہ مطلب نہیں کہ نماز میں کسی بھی سمت رخ کرنا جائز ہے، بلکہ یہ حکم ایسی صورت سے متعلق ہے جب کسی شخص کو قبلہ کی صحیح سمت معلوم نہ ہو اور وہ اجتہاد و تحری کے ذریعے قبلہ متعین کرنے کی کوشش کرے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:[11]

"وجوهكم في الصلوة للتحرى في القبلة۔"

ترجمہ: "نماز میں اپنے چہروں کا رخ قبلہ متعین کرنے کی کوشش (تحری) کے مطابق کرو۔"

اس تفسیر کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی استطاعت کے مطابق قبلہ کی سمت معلوم کرنے کی کوشش کرے اور پھر اسی سمت نماز ادا کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی عبادت کو قبول فرماتا ہے، خواہ بعد میں معلوم ہو کہ سمت متعین کرنے میں غلطی ہوئی تھی۔

تقابلی تجزیہ

دونوں مفسرین نے آیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ علامہ ماجدی کی توجہ زیادہ تر آیت کے اعتقادی اور کلامی مفہوم پر مرکوز ہے۔ انہوں نے "وجہ اللہ" کی تفسیر ذاتِ الٰہی سے کرتے ہوئے عقیدۂ تجسیم کی تردید کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تنزیہ، ہمہ گیری اور لامحدودیت کو واضح کیا ہے۔ اس کے برعکس علامہ شاہ منصوری نے آیت کے فقہی پہلو کو نمایاں کیا ہے اور اسے قبلہ کی تعیین کے مسئلے سے جوڑا ہے۔ ان کے نزدیک آیت اضطراری حالات میں اجتہادِ قبلہ اور قبولیتِ نماز کی دلیل ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ ماجدی کی تفسیر آیت کے اعتقادی اور عرفانی مضامین کو اجاگر کرتی ہے، جبکہ علامہ شاہ منصوری کی تفسیر اس کے فقہی اور عملی پہلو کو نمایاں کرتی ہے۔ دونوں تفسیری جہات ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور آیت کے مفہوم کو زیادہ جامع انداز میں واضح کرتی ہیں۔

آیتِ وصیتِ متوفیٰ عنہ کی زوجہ اور مسئلہ نسخ: آیت ﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ﴾ کا تفسیری جائزہ

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:[12]

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾

ترجمہ: ”اور تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں، وہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک نفقہ فراہم کرنے اور انہیں گھروں سے نہ نکالے جانے کی وصیت کر جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو دستور کے مطابق اپنے حق میں جو فیصلہ کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، اور اللہ بڑا غالب، بڑی حکمت والا ہے۔“

محلِ اشکال

اس آیت کے متعلق مفسرین کے ہاں بنیادی اشکال یہ پیدا ہوا ہے کہ بیوہ عورت کے لیے ایک سال تک نفقہ اور سکونت کا جو حکم اس آیت میں مذکور ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا یہ حکم مستقل اور واجب ہے یا بعد میں نازل ہونے والی آیاتِ میراث اور آیتِ عدت کے ذریعے منسوخ ہو چکا ہے؟ اسی مسئلے کی وضاحت میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں، جن میں نسخ اور استحباب کی بحث خاص اہمیت رکھتی ہے۔

تفسیر ماجدی کا موقف

علامہ عبد الماجد دریا آبادیؒ کے نزدیک یہ حکم ابتدائے اسلام میں اس وقت دیا گیا تھا جب میراث کے مستقل احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ بعد ازاں جب قرآنِ کریم نے وراثت میں بیوہ کا متعین حصہ مقرر کر دیا تو اس وصیت کا وجوب باقی نہ رہا اور مفسرین کی اصطلاح میں یہ حکم منسوخ قرار پایا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"یہ وصیت کا حکم اس وقت تھا جب میراث کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے، جب میراث کے مستقل احکام نازل ہو گئے اور شوہر کے ترکہ میں ایک مستقل حصہ بیوہ کا بھی مقرر ہو گیا، تو ظاہر ہے کہ اب حکمِ وصیت پر عمل کا کوئی محل باقی نہ رہا۔ اس کو مفسرین اپنی اصطلاح میں نسخ سے تعبیر کرتے ہیں۔"

مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ بیوہ عورت کو حاصل ابتدائی رعایتوں کا ذکر کرتے ہیں:

"اس وقت یعنی احکامِ میراث کے نزول سے قبل شریعت نے بیوہ عورتوں کے لیے حسبِ ذیل رعایتیں رکھی تھیں: (۱) وہ اگر شوہر ہی کے گھر رہنا چاہیں تو ایک سال تک انہیں کوئی بے دخل نہیں کر سکے گا۔ (۲) انہیں کھانا کپڑا ابھی اس مدت تک شوہر ہی کے ترکہ سے ملتا رہے گا۔ (۳) وہ خود اگر اپنی کسی مصلحت سے اس گھر میں رہنا نہ چاہیں تو بعد ختمِ عدت ان کے لیے یہ بالکل جائز تھا اور دوسرے حقوق کی طرح اس حق سے بھی دستبرداری کا انہیں حق حاصل تھا۔"

علامہ ماجدی اس حکم کے سماجی پہلو کو بھی نمایاں کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ اسلام نے پہلی مرتبہ بیوہ عورت کے معاشی اور سماجی حقوق کو باقاعدہ تحفظ فراہم کیا۔ ان کے نزدیک جاہلی معاشرے میں بیوہ عورت محرومی اور تحقیر کا شکار تھی، جبکہ اسلام نے اس کی عزت، سکونت اور کفالت کے حقوق کو قانونی حیثیت عطا کی۔

تفسیر البرہان کا موقف

علامہ عبد الہادی شاہ منصوریؒ اس آیت کے ضمن میں مفسرین کی اس رائے کو نقل کرتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے۔ تاہم ان کے نزدیک لفظ "وصیۃ" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ موجودہ حالت میں یہ حکم وجوب کے بجائے استحباب پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:[13]

"قیل في التفاسیر هذه الآیة منسوخة، وصیة أي الوصیة حکم الاستحباب بقرینة قوله: فإن خرجن."

ترجمہ: "تفاسیر میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، اور 'وصیت' سے مراد استحباب کا حکم ہے، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: 'فَاِنْ خَرَجْنَ'۔"

اس تفسیر کے مطابق اگرچہ ابتدائی وجوب منسوخ ہو چکا ہے، تاہم شوہر کی جانب سے بیوہ کے حق میں وصیت کرنا ایک مستحسن اور پسندیدہ عمل تصور کیا جاسکتا ہے۔

تقابلی تجزیہ

دونوں مفسرین اس امر پر متفق ہیں کہ آیت میں مذکور حکم اپنی ابتدائی صورت میں برقرار نہیں رہا اور بعد کے احکامِ میراث نے اس کی حیثیت کو تبدیل کر دیا ہے۔ تاہم دونوں کے زاویۂ نظر میں فرق پایا جاتا ہے۔ علامہ ماجدی نے نسخ کے تاریخی پس منظر، بیوہ عورت کے حقوق اور اسلام کی سماجی اصلاحات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ایک تدریجی قانونی ارتقاء کا حصہ تھا جس نے بیوہ عورت کے حقوق کے تحفظ میں بنیادی کردار ادا کیا۔

اس کے برعکس علامہ شاہ منصوری نے مختصر انداز میں نسخ کی رائے نقل کرتے ہوئے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے کہ آیت میں مذکور وصیت کا حکم بعد از نسخ استحباب کے درجے میں باقی سمجھا جاسکتا ہے۔ یوں ان کی توجہ حکم کی فقہی نوعیت اور اس کی موجودہ شرعی حیثیت پر زیادہ مرکوز ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے مراتبِ فضیلت: آیت ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ کا تفسیری جائزہ

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:[14]

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾

ترجمہ: ''یہ وہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمایا اور بعض کے درجات بلند کیے، اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا فرمائیں اور روح القدس کے ذریعے ان کی مدد کی۔''

محلِ اشکال

اس آیت میں ایک اہم تفسیری اور اعتقادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام انبیائے کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کے رسول ہیں تو پھر بعض کو بعض پر فضیلت دینے کا کیا مفہوم ہے؟ مزید یہ کہ قرآنِ کریم ایک مقام پر ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ کا اعلان کرتا ہے، جبکہ یہاں رسولوں کے درمیان فضیلت و درجات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بظاہر ان دونوں آیات میں تطبیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

تفسیر ماجدی کا موقف

علامہ عبد الماجد دریا آبادیؒ کے نزدیک اس آیت میں مذکور فضیلت سے مراد انبیائے کرام کے مابین مراتبِ قرب، درجات اور اللہ تعالیٰ کے ہاں خصوصی منازل کا تفاوت ہے۔ تاہم یہ فضیلت اللہ تعالیٰ کے علم اور مشیت کے اعتبار سے ہے، نہ کہ امت کے لیے اطاعت اور تعظیم کے اعتبار سے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:[15]

"مراتبِ قرب و منزلت میں فضل کے لفظی معنی بزرگی کے ہیں، یعنی ایسی صفت جس سے انسان دنیا میں مدح و ثنا کا مستحق ہو اور آخرت میں اجر سے

سرفراز ہو۔فضلنا میں ضمیر متکلم کالحاظ رہے۔ یہ تفضیل یاباہمی فضیلت جو کچھ ہے محض عند اللہ ہے۔خالق کے ہاں درجات و مراتبِ قربت کے لحاظ سے ہے۔ خلق کے لیے بہ حیثیت مطاع سب یکساں ہیں۔عام خلقت کے لیے رسول سب برابر ہیں۔اطاعت و تعظیم سب کی یکساں واجب ہے۔"

مزید فرماتے ہیں:[16]

"لا نفرق بين أحد من رسله ليس مقام التفضيل إليكم إنما هو إلى الله عز وجل وعليكم الانقياد والتسليم له والإيمان به۔"

علامہ ماجدی کے نزدیک آیت کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کو بعض خصوصی فضائل اور درجات عطا فرمائے ہیں، لیکن امت کے لیے تمام انبیاء پر ایمان لانا، ان کی تعظیم کرنا اور ان کی اطاعت کو تسلیم کرنا یکساں ضروری ہے۔

تفسیر البرہان کا موقف

علامہ عبد الہادی شاہ منصوریؒ کے نزدیک آیت میں مذکور فضیلت سے مراد مطلق اور کلی فضیلت نہیں بلکہ فضیلتِ جزئیہ ہے۔یعنی ہر نبی کو کسی نہ کسی خاص وصف، معجزے یا امتیازی شرف کے اعتبار سے دوسروں پر فضیلت عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ مختصراً لکھتے ہیں:[17]

"المراد من الفضيلة الجزئية۔"

یعنی آیت میں جزوی اور مخصوص فضیلت مراد ہے۔

اس توضیح کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ کلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نمایاں معجزات اور حضرت محمد ﷺ کو جامع کمالات، ختمِ نبوت اور بلند ترین درجات عطا کیے گئے۔ لہٰذا ہر نبی کسی خاص پہلو سے ممتاز ہے، اور آیت کا مقصود انہی امتیازات کا بیان ہے۔

تقابلی تجزیہ

دونوں مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ آیت میں انبیائے کرام علیہم السلام کے درمیان فضیلت کا اثبات کیا گیا ہے، تاہم اس فضیلت کی نوعیت کی وضاحت میں ان کے اسلوب مختلف ہیں۔علامہ ماجدی نے فضیلت کو مراتبِ قربِ الٰہی اور درجاتِ نبوت سے متعلق قرار دیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ تفاوت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے، جبکہ امت کے لیے تمام انبیاء کی تعظیم و اطاعت یکساں واجب ہے۔اس طرح انہوں نے آیتِ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ اور آیتِ تفضیل کے درمیان تطبیق بھی واضح کر دی ہے۔

دوسری جانب علامہ شاہ منصوری نے فضیلت کو "فضیلتِ جزئیہ" سے تعبیر کیا ہے، یعنی ہر نبی کو کسی مخصوص کمال، معجزے یا منصب کے اعتبار سے دوسروں پر برتری عطا کی گئی ہے۔یوں ان کی تفسیر فضیلت کے مصادیق اور اس کی عملی صورتوں کو نمایاں کرتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا سوالِ احیائے موتیٰ اور حقیقتِ اطمینانِ قلب: آیت ﴿رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ﴾ کا تفسیری جائزہ

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:[18]

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَى وَلَكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي﴾

ترجمہ:"اور (وہ واقعہ بھی یاد کریں) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے عرض کیا: میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ فرماتا ہے؟ ارشاد ہوا: کیا تم یقین نہیں رکھتے؟ عرض کیا: کیوں نہیں، لیکن (چاہتا ہوں کہ) میرے دل کو مزید اطمینان حاصل ہو جائے۔"

محلِ اشکال

اس آیت میں ایک اہم اعتقادی اور تفسیری اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی اور خلیل اللہ تھے، پھر ان کا یہ کہنا کہ "رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ" کیا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں احیائے موتیٰ پر کامل یقین حاصل نہ تھا؟ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوال

"أَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ" اور حضرت ابراہیمؑ کے جواب "بَلَىٰ" کے درمیان کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ اس اشکال کے حل میں مفسرین نے یقین کے مختلف درجات، خصوصاً علم الیقین اور عین الیقین کے فرق کو بنیاد بنایا ہے۔

تفسیر ماجدی کا موقف

علامہ عبد الماجد دریا آبادیؒ کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ کا سوال کسی شک یا تردد کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اس کا مقصد یقین کے اعلیٰ درجے، یعنی مشاہداتی یقین، کا حصول تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سوال اس لیے کیا تاکہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے ان کے کامل ایمان کا اظہار ہو جائے اور امت کو یہ تعلیم ملے کہ ہر سوال بے اعتقادی کی علامت نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"سوال سے مقصود یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ایمانِ کامل کا اقرار خود ان کی زبان سے کرالیا جائے، اور دنیا کو یہ تعلیم بھی مل جائے کہ ایسے سوالات ہمیشہ بے اعتقادی یا فقدانِ ایمان ہی سے نہیں پیدا ہوتے۔ حضرت ابراہیمؑ عرض کرتے ہیں کہ ایمان کے درجہ تک تو یقین اب بھی حاصل ہے، ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مشاہدہ کے بعد اطمینان اور زیادہ حاصل ہو جائے۔ اس مرتبہ کو اصطلاح میں عین الیقین کہتے ہیں، ورنہ یقین مرتبۂ تصدیق تک، جسے اصطلاح میں علم الیقین کہتے ہیں، ہر مومن کو حاصل ہوتا ہے۔"

مزید لکھتے ہیں:[19]

"مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ ایمان ہی بڑھتے بڑھتے اطمینانِ قلب پیدا ہو جاتا ہے، اور محققین کہتے ہیں کہ یہ ترقی کبھی مشاہدہ و معائنہ سے ہوتی ہے اور کبھی محض وجدان سے۔۔۔ حضرت ابراہیمؑ کو طمانیت کا وہ درجہ حاصل تھا جو ولایت و صدیقیت کے مناسب تھا، اور آپ کو طلب اُس طمانیت کی تھی جو درجۂ نبوت کے مناسب مقام ہو۔"

علامہ ماجدی کے نزدیک اس واقعے کا اصل مقصد یقین کی تکمیل اور مشاہدۂ قدرتِ الٰہی کے ذریعے قلبی اطمینان میں مزید اضافہ تھا، نہ کہ ایمان میں کسی کمی کا ازالہ۔

تفسیر البرہان کا موقف

علامہ عبد الہادی شاہ منصوریؒ بھی اس آیت کو یقین کے درجات کے تناظر میں سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کامل ایمان رکھتے تھے، لیکن براہِ راست مشاہدہ دل کو مزید اطمینان عطا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ "لِّيَطۡمَئِنَّ قَلۡبِي" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[20]

"أي برؤيته."

یعنی: "اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے ذریعے۔"

اس تشریح کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا مقصود صرف یہ تھا کہ جس حقیقت پر انہیں علمی یقین حاصل ہے، اسے مشاہداتی صورت میں بھی دیکھ لیں تاکہ قلبی اطمینان مزید کامل ہو جائے۔ اس طرح آیت علم الیقین سے عین الیقین کی طرف ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہے۔

تقابلی تجزیہ

دونوں مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے سوال کا تعلق شک یا عدمِ ایمان سے نہیں تھا، بلکہ یقین کے اعلیٰ درجے کے حصول سے تھا۔ علامہ ماجدی نے اس مسئلے کو زیادہ تفصیل سے بیان کرتے ہوئے علم الیقین، عین الیقین، اطمینانِ قلب اور روحانی مدارج کی بحث کو واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ کے ایمان میں کوئی کمی نہیں تھی، بلکہ وہ مشاہدے کے ذریعے مزید طمانیت کے طالب تھے۔

دوسری جانب علامہ شاہ منصوری نے مختصر مگر جامع انداز میں یہی نکتہ بیان کیا ہے کہ "اطمینانِ قلب" سے مراد مشاہدۂ عینی کے ذریعے حاصل ہونے والا سکون ہے۔ ان کی تفسیر کا مرکز یقین کے عملی اور تجرباتی پہلو پر ہے، جبکہ علامہ ماجدی نے اس کے عرفانی اور نفسیاتی ابعاد کو بھی نمایاں کیا ہے۔

نتائج بحث

1. اس تقابلی مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تفسیر ماجدی اور تفسیر البرہان دونوں کا بنیادی منہج قرآن فہمی میں باہمی تکمیل کا ہے، نہ کہ حقیقی تعارض کا۔

2. دونوں تفاسیر میں "مشکلاتُ القرآن" کے تحت زیرِ بحث آیات کے فہم میں یہ اصول مشترک طور پر پایا جاتا ہے کہ قرآنی اشکالات بظاہر ہوتے ہیں، حقیقتاً نہیں ہوتے، بلکہ وہ سیاق، لغت یا مراتبِ معنی کے عدمِ فہم سے پیدا ہوتے ہیں۔

3. اکثر آیات میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اختلافِ تعبیر اختلافِ معنی نہیں بلکہ اختلافِ اسلوب ہے؛ تفسیر ماجدی تفصیلی توضیح پیش کرتی ہے جبکہ تفسیر البرہان اختصار کے ساتھ اصل مفہوم کو بیان کرتی ہے۔

4. آیت ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ کے ضمن میں دونوں تفاسیر اس نتیجے پر متفق ہیں کہ ہدایت کا عموم تمام انسانوں کے لیے ہے، جبکہ اس سے حقیقی استفادہ تقویٰ کے ساتھ مشروط ہے۔

5. آیت ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ کے تحت یہ واضح ہوتا ہے کہ دلوں پر مہر لگنا ابتدائی جبر نہیں بلکہ انسان کے اختیاری انکارِ حق کا نتیجہ ہے، جس سے مسئلہ جبر و اختیار کی متوازن تعبیر سامنے آتی ہے۔

6. آیت ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ "وجہ اللہ" سے مراد اللہ کی ذات ہے، اور آیت کا تعلق تنزیہِ باری تعالیٰ اور ہمہ گیریٔ علم و قدرت سے ہے، نہ کہ قبلہ کی نفی سے۔

7. آیت ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا﴾ کے مطابق انبیاء کے درمیان فضیلت کا مطلب جزوی یا اعتباری درجات ہیں، نہ کہ مطلق برتری جو ایمان میں تفریق کا باعث بنے۔

8. آیت ﴿رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ﴾ سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا سوال شک نہیں بلکہ عین الیقین کے حصول کی طلب تھا، اور ایمان کے درجات میں اضافہ فطری امر ہے۔

9. آیت ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ﴾ سے واضح ہوتا ہے کہ "خرابۂ مساجد" سے مراد صرف عمارت نہیں بلکہ عبادت اور ذکرِ الٰہی سے روکنا بھی شامل ہے، اور مساجد کا احترام اسلامی شعائر کا بنیادی حصہ ہے۔

10. مجموعی طور پر یہ مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ دونوں تفاسیر کے مطابق قرآنِ کریم میں کوئی حقیقی تعارض نہیں پایا جاتا، بلکہ ہر بظاہر مشکل آیت کی توجیہ اصولِ تفسیر، سیاق اور کلامی مباحث کے ذریعے ممکن ہے، اور یہی قرآن فہمی کا معتدل منہج ہے۔

تجاویز و سفارشات

1. قرآنِ کریم کے فہم میں "مشکلاتُ القرآن" جیسے مباحث کو حل کرنے کے لیے طلبہ و محققین کو سیاقِ آیات اور اصولِ تفسیر کو بنیادی اہمیت دینی چاہیے، تاکہ بظاہر پیدا ہونے والے اشکالات درست تناظر میں سمجھ میں آئیں۔

2. مدارس اور جامعات میں تفسیر کے مطالعے کے دوران تقابلی مطالعہ کو فروغ دیا جائے، خصوصاً کلاسیکی اور جدید تفاسیر کے درمیان، تاکہ فکری توازن اور وسعت پیدا ہو۔

3. اس امر کی ضرورت ہے کہ طلبہ کو محض متن فہمی تک محدود رکھنے کے بجائے انہیں کلامی مباحث (جبر و اختیار، صفاتِ باری تعالیٰ، مراتبِ انبیاء) سے بھی روشناس کرایا جائے، کیونکہ اکثر تفسیری اشکالات انہی مباحث سے متعلق ہوتے ہیں۔

4. تحقیقی سطح پر ایسے موضوعات پر مزید کام کیا جائے جو مختلف تفاسیر کے منہج، اسلوب اور فکری رجحانات کا موازنہ پیش کریں، تاکہ قرآن فہمی کے متنوع زاویے سامنے آسکیں۔

5.عام قارئین کے لیے قرآن فہمی کو آسان بنانے کے لیے ایسی تحریریں اور دروس تیار کیے جائیں جو سادہ زبان، دلائل اور تقابلی انداز میں مشکل آیات کی وضاحت کریں، تاکہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو اور قرآن سے عملی تعلق مضبوط ہو۔

مصادر و مراجع:

[1] سورۃ البقرۃ،2

[2] دریابادی، عبد الماجد، تفسیر ماجدی، ص:13

[3] شاہ منصوری، عبد الہادی، تفسیر البرہان فی مشکلات القرآن، ص:2

[4] سورۃ البقرۃ،7

[5] تفسیر البرہان فی مشکلات القرآن، ص:8

[6] سورۃ البقرۃ،114

[7] تفسیر ماجدی، ص:26

[8] تفسیر البرہان فی مشکلات القرآن، ص:12

[9] سورۃ البقرۃ،115

[10] تفسیر ماجدی، ص:123

[11] تفسیر البرہان فی مشکلات القرآن، ص:16

[12] سورۃ البقرۃ،240

[13] تفسیر البرہان فی مشکلات القرآن، ص:23

[14] سورۃ البقرۃ،253

[15] تفسیر ماجدی، ص:89

[16] حوالہ بالا

[17] تفسیر البرہان فی مشکلات القرآن، ص:34

[18] سورۃ البقرۃ،260

[19] تفسیر ماجدی، ص:123

[20] تفسیر البرہان فی مشکلات القرآن، ص:43